اپنی تربیت آپ
(قرآن کریم کی روشنی میں)

خرم مراد

تربیت کا عمل انسان کے پیدا ہوتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ تربیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے جو خود بخود ہو جاتی ہے، جب کہ کچھ تربیت انسان اپنی کوشش سے کرتا ہے۔ تربیت کے معنی کسی چیز کو نشو ونما دینا، بڑھانا اور تقویت دینا ہے۔ تربیت سے ملتا جلتا ایک اور لفظ بھی استعمال ہوتا ہے، وہ ہے تزکیہ۔ اس میں پاکیزہ کرنا اور نشو نما دینا، دونوں معنی شامل ہیں۔ انسان کے پیدا ہوتے ہی اس کی تربیت کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کا جسم بڑھنا شروع کرتا ہے۔ آئندہ زندگی میں درپیش مراحل کے لیے مختلف صلاحیتیں اور استعداد بتدریج پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔

انسان کی تربیت قدرتی بھی ہوتی ہے اور گرد و پیش کے حالات و مشاہدات سے بھی دوسروں سے سیکھ کر بھی اور لکھ پڑھ کر بھی۔ لیکن تربیت کی اصل ذمہ داری ایک فرد کی اپنی ہی ہے۔ تربیت کے عمل میں یہ سب سے پہلا اور بنیادی سبق ہے جو ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے۔

ہم جیسا بھی بننا چاہیں، وہ اپنی کوشش سے اور اپنے عمل سے بنیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو بہت واضح اور صاف طور پر بیان فرما دیا ہے کہ آدمی کے حصے میں وہی کچھ آتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔

وان لیس للانسان الا ما سعیٰ۔ (النجم/۳۹)

(اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے۔)

جو آدمی خود کچھ نہ بننا چاہے، وہ دوسروں کے بنانے سے نہیں بن سکتا۔ آدمی اپنی محنت اور کوشش سے ہی اپنے آپ کو وہی کچھ بناتا ہے جو وہ بننا چاہتا ہے۔ لہٰذا تربیت کے ضمن میں بنیادی بات اپنی اِس ذمہ داری کو سمجھنا ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ:

قد افلح من تزکّٰی (الاعلیٰ/۱۴)

(فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی۔)

تزکّٰی کا لفظ عربی زبان میں جس وزن پر اور جن معنوں میں آیا ہے، اس میں انسان کا اپنے اوپر محنت سے کسی کام کو کرنے کا مفہوم بھی شامل ہے۔ اسی وزن پر تدبر اور تذکر ہیں۔ تدبر آدمی خود کرتا ہے، کوئی دوسرا زبردستی نہیں کروا سکتا۔ تذکر کے معنی کسی چیز کو یاد کرنے اور یاد رکھنے کے ہیں۔ یہ بھی آدمی خود کرتا ہے، کوئی دوسرا نہیں کروا سکتا۔ چنانچہ تزکّٰی سے مراد اہتمام کے ساتھ اپنی کوشش سے اپنا تزکیہ کرنا، اپنے آپ کو برائیوں سے پاک کرنا اور اپنی نشوونما اور ارتقا کی کوشش کرنا ہے جو دراصل آدمی کی اپنی ذمہ داری ہے۔ اسی لیے جہاں تزکّٰی کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں یہ بھی فرمایا گیا:

قد افلح من زکّٰھا (الشمس/۹)

(یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا۔)

تزکیہ کسی کام کو بتدریج کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ گویا اس کے معنی یہ ہے کہ نفس کو پاک صاف کرنے کا کام مسلسل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ جتنے بیرونی محرکات اور تربیت کے ذرائع ہیں، وہ اللہ کی وحی ہو یا اس کی کتاب، یا اس کے رسول علیہم السلام جو اس دنیا میں رہنمائی کے لیے آتے رہے ہیں، یا صالح صحبت جو آدمی کو نصیب ہوتی ہے، یا کتابیں اور لٹریچر ہو، یا درس قرآن اور اجتماعات ہوں، ان سب کی حیثیت معاون و مددگار کی ہے۔ اگر زمین بنجر ہے اور اس میں بیج موجود نہیں ہے تو باہر سے خواہ کتنا ہی پانی دیا جائے، کتنی ہی کھاد ڈالی جائے، کتنی ہی محنت کی جائے، فصل نہیں اگے گی۔ فصل تو اسی وقت اگے گی جب زمین میں فصل اگانے کی صلاحت موجود ہو اور بیج موجود ہو جو پودے اور درخت کی شکل اختیار کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے ایسے لوگ جو نبی کریمؐ کی صحبت میں بیٹھتے تھے، آپ کا کلام سنتے تھے، آپؐ کے ساتھ نمازیں پڑھتے تھے، یا آپ ﷺ سے واقف تھے، وہ کافر اور منافق ہی رہے۔ انھیں سچا ایمان لانے کی توفیق نصیب نہیں ہوئی۔ اگر محض کسی اچھی بات کا سن لینا اور کسی اچھی صحبت میں بیٹھ جانا ہی کافی ہوتا، تو ان میں سے ہر ایک کو ایمان کی دولت نصیب ہو جاتی، لیکن جنھوں نے خود صحیح بات کو نہ ماننا چاہا اور صحیح راستے پر نہ چلنا چاہا، ان کے لیے ان میں سے کوئی چیز بھی مددگار ثابت نہ ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نبی کریمؐ کو مخاطب کر کے فرمایا:

انک لا تھدی من احببت (القصص/۵٦)

(اے نبیؐ! تم جسے چاہو اسے ہدایت نہیں دے سکتے۔)

یہ اللہ کا قانون ہے اور اس کے تحت ہی وہ لوگوں کو توفیق بخشتا ہے، اور توفیق کا انحصار آدمی کے اپنے ارادے اور خواہش پر ہوتا ہے۔ اسی بنا پر آدمی سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے۔

اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ محض لٹریچر کے مطالعے سے انسان کی تربیت ہو جائے گی اور وہ اچھا انسان بن جائے گا تو یہ بات درست نہیں، اگرچہ لٹریچر کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ لیکن تربیت کے لیے صرف لٹریچر کا مطالعہ کافی نہ ہوگا، جب تک آدمی اس پر عمل کرنے کی خود کوشش نہ کرے۔ اسی طرح موثر تقاریر اور تربیت گاہیں اور قرآن مجید کا پڑھنا بھی کافی نہ ہوگا۔ یورپ کے بعض مفکرین نے قرآن کو پڑھنے، عربی جاننے اور تفسیریں پڑھنے میں عمر کھپادی، بڑی شان دار کتابیں بھی لکھیں، لیکن ان کو ایمان کی دولت نصیب نہیں ہوئی اور نہ عمل کی توفیق ہی ملی۔ لہٰذا تربیت کے لیے جو چیز اہم ترین ہے وہ دراصل آدمی کا اپنا ارادہ اور کوشش ہے۔

لوگ شکایت کرتے ہیں کہ تربیت کی کمی ہے، انحطاط ہے، معیار گر گیا ہے، لٹریچر نہیں پڑھا جاتا، لوگوں کے اندر عملی کمزوریاں ہیں، لہٰذا تربیتی پروگرام زیادہ ہونے چاہییں، تاکہ معیاری افراد تیار ہو سکیں اور صحیح نہج پر تربیت ہو۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ لٹریچر پڑھنا ضروری ہے، قرآن مجید کا مطالعہ بھی ضروری ہے اور تربیت گاہیں بھی ضروری

ہیں، لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی مسئلے کا اصل حل نہیں ہے۔ تربیت کی بنیاد تو ایک فرد کی اپنی محنت ہے، اپنا ارادہ ہے اور اپنی کوشش ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔ اسی لیے نبی کریمؐ نے فرمایا: کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیّتہ، تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ جو جس کا نگہبان ہے وہ اس کے بارے میں جواب دہ ہے۔ سب سے بڑھ کر تو انسان کا اپنا نفس اور اس کی زندگی ہے جس کے لیے وہ جواب دہ ہے۔ اس وقت کی جواب دہی ہے جو تیزی سے گزرتا چلا جارہا ہے۔ زندگی ایک نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے اور جو برف کی طرح پگھل رہی ہے اور ہاتھ سے نکلی چلی جارہی ہے۔ اس کے لیے انسان، خدا کے ہاں جواب دہ ہے۔ سورۃ العصر میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

والعصر إن الانسان لفی خسر .(العصر/۲۱)

(زمانے کی قسم، انسان درحقیقت خسارے میں ہے۔)

وقت کس قدر تیزی سے گزر رہا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہر گزرنے والا لمحہ انسان کی عمر گھٹا رہا ہے۔ ہم رات کو سوتے ہیں اور صبح کو اٹھتے ہیں، لیکن ہماری زندگی کا ایک دن کم ہو چکا ہوتا ہے اور وہ کبھی دوبارہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔ لہٰذا کامیاب وہ ہے جو زندگی کی قدر جانے اور آنے والے کل کے لیے آج سامان کرے۔ یہ قدر اسی کو ہوگی جسے جواب دہی کا احساس ہو، جو اپنا تزکیہ کرے، برائیوں کو دبائے اور بھلائیوں کو نشوونما دے، البتہ اس عمل کی بنیاد انسان کا اپنا ارادہ اور کوشش ہے۔

وان لیس للإنسان إلا ما سعیٰ .(النجم/ ۳۹)

(اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے۔)

انسان کی زندگی، اس کی کھیتی، اس کا کاروبار، اس کو بنانا اور سنوارنا، اس میں نیک اعمال کے بیج بونا اور نیک اعمال کی کھیتی اگانا، یہ اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ کسی دوسرے کے کرنے سے یہ نہیں ہوسکتا۔ اگر کوئی نماز نہ پڑھے تو کوئی دوسرا اس کی جگہ نہ نماز پڑھ سکتا ہے اور نہ زبردستی اُسے نماز پڑھوا سکتا ہے۔ اگر نماز میں اللہ کے حضور حاضری اور

خشوع وخضوع سے گفتگو کا تصور آدمی خود نہ پیدا کرے تو کسی تقریر اور درس قرآن سے یہ پیدا نہیں ہوگا۔ یہ تو ممکن ہے کہ نماز بہتر بنانے پر کوئی تقریر سن کر ایک آدھ نماز بہتر پڑھ لی جائے لیکن اس کے بعد پھر توجہ بٹ جاتی ہے بھول ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ ارادے کی کمزوری، غفلت اور بھول انسان کے مزاج کا حصّہ اور فطری امر ہیں۔ البتہ اگر یہ مرض ہے تو اس کی دوا بھی موجود ہے۔ اللہ کی یاد سے غفلت کا علاج ہو جاتا ہے، لیکن اگر اللہ کو یاد ہی نہ کیا جائے تو غفلت کیسے دور ہو سکتی ہے؟ لہٰذا جو کچھ بھی تربیت ہوگی وہ اپنی کوشش سے، اپنی محنت سے اور اپنے ارادے سے ہوگی نہ کہ محض وعظ و نصیحت یا تربیت گاہ میں شرکت سے۔

ایک فرد کے نزدیک جس چیز کی جتنی قدر و قیمت ہوتی ہے، وہ اس کے لیے اتنی ہی تگ ودو و کوشش اور محنت کرتا ہے۔ وہ اگر کوئی دکاندار ہے تو وہ یہ نہیں سوچتا کہ میں گھر بیٹھا رہوں، یا دعا کرتا رہوں، یا کسی بزرگ کی برکت ہوگی، یا میں تجارت کے فضائل پر اور دکان میں مال رکھنے کی اہمیت پر کوئی تقریر کروں گا تو اس سے مال فروخت ہوگا۔ دکان تو تب چلے گی جب سودا لایا جائے، دکان میں رکھا جائے، گاہک آئیں اور سودا بیچا جائے، تب نفع ہوگا۔ دکان چلانے اور نفع کمانے کا اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ زندگی بھی ایک دکان اور تجارت کی طرح ہے۔ یہ جنت کو کمانے کی تجارت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَـا أَيُّهَـا الَّـذِيْـنَ آمَـنُـوا هَـلْ أَدُلُّـكُـمْ عَـلَـى تِجَـارَةٍ تُنجِيْكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيْمٍ (الصّف/۱۰)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، کیا میں بتاؤں تم کو وہ تجارت جو تمھیں عذابِ الیم سے بچادے؟)

یہ تجارت 'زندگی کو اللہ کی راہ میں کھپانے' جنت کمانے اور جہنم سے بچنے کی ہے۔ اگر کوئی یہ سوچے کہ یہ تجارت محض خواہش، تمنا اور آرزو سے ہو جائے گی اور نفع حاصل ہو جائے گا، یا محض تقریر یا درس سننے سے ہو جائے گی تو ایسا نہیں ہوگا، بلکہ فصل حاصل کرنے کے لیے جس طرح کھاد اور پانی ضروری ہے، اسی طرح تربیت کے لیے تقریر اور درس قرآن بھی اہم اور ضروری چیزیں ہیں، لیکن اصل کام اپنا ارادہ اور کوشش ہے۔

لہذا تربیت کے عمل میں سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ عمر، یہ زندگی، یہ جسم، یہ جان، اگر میں تاجر ہوں تو میری یہ دکان اور کاروبار اور اگر میں کسان ہوں تو میری یہ کھیتی، اس میں جو کچھ پیدا ہوگا، جو فصل اُگے گی، وہ میرے ارادے اور کوشش سے ہی اُگے گی۔

قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ:

وَمَنْ أَرَادَ الآخِـرَةَ وَسَعَى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَئِكَ كَانَ سَعْيُهُم مَشْكُوراً (بنی اسرائیل/۱۹)

(اور جو آخرت کا خواہش مند ہو اور اس کے لیے سعی کرے جیسی کہ اس کے لیے سعی کرنی چاہیے، اور ہو وہ مومن، تو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور ہوگی۔)

گویا جس نے یہ ارادہ کرلیا کہ مجھے آخرت کمانا ہے اور اس کے لیے محنت کی جیسا کہ محنت کرنی چاہیے اور ایمان کا بیج موجود ہو اور عمل ہو تو اس کی کوشش کی پوری قدردانی کی جائے گی۔

اللہ کو تو بس یہی مطلوب ہے کہ آدمی ارادہ کرے، عزم کرے اور فیصلہ کرے کہ اسے آخرت کمانا ہے، اللہ کی رضا حاصل کرنا ہے، وہ اعمال اور محنت کرنی ہے جس سے اسے یہ چیز حاصل ہوسکے اور پھر اپنی حد تک کوشش کرے جتنی اللہ نے اسے ہمت اور قوت دی ہے۔ اس سے زیادہ کسی سے مطالبہ نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ یہ بات کہ اپنا کام خود کرنا، اپنی ذمہ داری کو خود سنبھالنا، اپنی کھیتی اور اپنی دکان کی خود فکر کرنا، اس کو تیار کرنے اور چلانے کے لیے پوری محنت اور کوشش کرنا، ہر فرد کی اپنی ذمہ داری ہے۔ کوئی دوسرا یہ ذمہ داری نہیں اٹھا سکتا۔ اگر اس نے اس راز کو پالیا، تو تربیت کا راستہ اس کے لیے کھل گیا۔

قرآن میں ہے کہ لوگ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کے سامنے عذر تراشیں گے کہ یہ تو ہمارے بڑوں سے، آباؤ اجداد سے ہوتا چلا آرہا تھا، ہم نے تو ان کی پیروی کی، لیکن اللہ تعالیٰ اس عذر کو بھی قبول نہیں کریں گے۔ لوگ کہیں گے کہ یہ ہمارے سردار تھے، پیشوا تھے، علماء تھے، لیڈر تھے، ہم تو ان کی وجہ سے گمراہ ہوئے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ اس عذر کو بھی قبول نہیں فرمائیں گے اور ان کو معاف نہیں کیا جائے گا۔ دراصل ہر آدمی اپنے اعمال کے لیے

خود ہی ذمہ دار اور جواب دہ ہے۔ قیامت کے روز شیطان بھی کھڑا ہو جائے گا اور کہے گا کہ اپنی برائی کے تم خود ذمہ دار ہو۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ میرا تم پر کوئی زور نہیں تھا۔ میں نے تو تمھیں محض ترغیب دی تھی، للچایا تھا، برائی کی طرف دعوت دی تھی اور تم نے میری دعوت خود قبول کی تھی۔

إِلَّا أَن دَعَوۡتُكُمۡ فَٱسۡتَجَبۡتُمۡ لِيۖ فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوٓاْ أَنفُسَكُم (ابراہیم/۲۲)

(میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں، میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنے راستے کی طرف تم کو دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا، اب مجھے ملامت نہ کرو، اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔)

گویا اگر تم بگڑ گئے، خرابی کا شکار ہوئے، اچھے انسان نہیں بنے، گناہ گار ٹھہرے تو دوسروں کو موردِ الزام مت ٹھہراؤ، اس کے تم خود ہی ذمہ دار ہو۔

دراصل بنیادی ذمہ داری تو ہر شخص کی اپنی ہی ہے۔ ہر آدمی اللہ کے سامنے اکیلا حاضر ہوگا، اور وہ اکیلا ہی اپنے عمل کی جواب دہی کرے گا۔ اگر کوئی مجبور ہوگا، یا معقول عذر ہوگا تو اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے گا۔ البتہ کسی دوسرے پر الزام لگا کر اپنی ذمہ داری سے بری نہیں ہوا جا سکتا۔ یہ بات بالکل واضح ہے اور جو آدمی اس بنیادی اصول سے ہی واقف نہ ہو، وہ صحیح معنوں میں اپنی تربیت نہیں کر سکتا۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بھی انسان کو اس سے زیادہ مکلّف نہیں بنایا، یا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جتنی اس کی استطاعت ہو۔ اس نے انسان پر ایسا کوئی بوجھ نہیں ڈالا جو وہ نہ اٹھا سکتا ہو۔

لَا يُكَلِّفُ ٱللَّهُ نَفۡسًا إِلَّا وُسۡعَهَاۚ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَعَلَيۡهَا مَا ٱكۡتَسَبَتۡ (البقرۃ/۲۸۶)

(اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔)

ہر ایک کے لیے اُس کے اچھے اور بُرے عمل کے مطابق ہی بدلہ ہے۔ گویا اگر ایک طرف خوشخبری ہے تو دوسری طرف بڑی سخت گرفت اور پکڑ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے مجھے کچھ کرنے کا جو موقع دیا ہے، اس کا میں خود ذمہ دار ہوں، اور جس برائی کا میں

مرتکب ہوا، اس کا بھی میں خود ہی ذمہ دار ہوں گا کوئی دوسرا ذمہ دار نہیں ہے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ (آل عمران/۱۰۲)

(اے لوگوں! جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔)

اس پر صحابہ کرامؓ کانپ اٹھے اور لرز کر رہ گئے کہ کون ہے جو اللہ سے ویسا ہی تقویٰ اختیار کرے جیسا کہ اس کا حق ہے۔ اللہ سے تقویٰ کرنے کا تو کوئی حق ادا نہیں کرسکتا۔ پھر جب یہ آیت نازل ہوئی:

فاتقوا الله ما استطعتم (التغابن/۱۶)

(جہاں تک تمھارے بس میں ہو اللہ سے ڈرتے رہو۔)

یعنی جتنی تمھاری استطاعت ہے اتنا اللہ سے تقویٰ اختیار کرو تو انھیں اطمینان ہوا اور ان کی جان میں جان آئی۔ لہذا کون کیا کرسکتا ہے، یا اسے کیا کرنا چاہیے، اس حوالے سے بہت زیادہ سوچنے یا کسی ذہنی الجھن کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں، بلکہ آدمی جس قدر بھرپور محنت کرسکتا ہے وہ کرنی چاہیے۔ اگر غلطی ہوجائے یا گناہ سرزد ہوجائے تو اللہ تعالیٰ سے استغفار کرنا چاہیے اور پھر اس کی اطاعت و فرماں برداری کی راہ پر لگ جانا چاہیے۔ اسلام میں مایوسی کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔

اللہ نے ہر ایک پر وہی ذمہ داری ڈالی ہے جو وہ اٹھا سکتا ہے۔ اس لیے اس نے ہر مسلمان پر جو فرائض عائد کیے ہیں، وہ کسی انسان کے بس سے باہر نہیں۔ اگر کوئی معاملہ اس کے بس میں نہ ہو تو شریعت میں اس کے لیے چھوٹ موجود ہے۔ اگر کوئی آدمی بے ہوش ہوجائے تو نماز کا کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ کوئی بیمار ہوجائے تو کھڑے ہوکر پڑھنے کی کوئی ذمہ داری اس پر نہیں ہے، اگر پانی نہ ملے تو تیمم کرکے پڑھے۔ اگر کوئی پاگل ہے تو اس سے کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ غرض جہاں بھی کوئی کام کسی کے بس میں نہ ہو تو شریعت

اس کے لیے راستہ کھول دیتی ہے، اور جو ممکن ہے، اختیار سے باہر نہیں، اس کے لیے کوئی عذر قابلِ قبول نہیں۔

نماز پڑھنا آدمی کے اختیار میں ہے، اللہ تعالیٰ سوال کرے گا کہ تم نے نماز کیوں نہیں پڑھی۔ نماز کے تقاضوں میں سے ایک اہم تقاضا یہ ہے کہ نماز کے اندر خشوع ہو، اور اس کے لیے کوشش کرنا بندے کے اختیار میں ہے۔ لہٰذا وہ یہ پوچھے گا کہ تم نے نماز میں خشوع پیدا کرنے اور اس کو بہتر بنانے کے لیے کیا کوشش کی، لیکن نماز میں کتنا خشوع پیدا ہوگا یہ بندے کے بس میں نہیں ہے۔ آدمی کا دل کبھی اس کے اختیار میں ہوتا ہے اور کبھی نہیں۔ کئی قسم کے خیالات اور وسوسے دل کو غافل کر دیتے ہیں۔ دل پر انسان کو مکمل اختیار نہیں دیا گیا۔ اپنے آپ کو متوجہ رکھنا تو انسان کے اختیار میں ہے لیکن دل کی کیفیت ایک سی رہے، یہ ہمارے بس میں نہیں ہے۔ لہٰذا جو کام آدمی کے بس میں ہو، وہ کام کرنا اس کی ذمہ داری ہے، اور وہ اس کا مکلّف ہے۔

اسی طرح ایک داعی کی حیثیت سے دوسروں تک بات پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے اور اس کے لیے حتی المقدور کوشش کرنا، ذرائع و وسائل اختیار کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن یہ بات سوچنا کہ ان سب کے باوجود لوگ لازماً ہماری بات مان لیں تو اس کے ہم ذمہ دار نہیں ٹھہرائے گئے۔ البتہ اپنی بیوی بچوں کو نیکی کی تلقین کرنا اور ترغیب دینا، اپنے دوستوں کو نیکی کی دعوت دینا، یہ تو ہمارے اختیار میں ہے اور اس کے لیے ہم سے پرسش ہوگی، مواخذہ ہوگا۔ اس کے بعد اگر کوئی بات نہ مانے اور لوگ نہ سنیں، یا سنی ان سنی کر دیں تو اس پر کوئی جواب دہی نہیں ہے۔ اگر کوئی ہماری بات نہ مانے تو اس پر ہمارے اجر میں کوئی کمی نہ ہوگی اور نہ کوئی مواخذہ ہوگا۔ اصل بات جو ہمارے اختیار اور ہمارے بس میں ہے، وہ ہے کام کرنا، یہ ہماری ذمہ داری ہے۔ یہ دوسرا بڑا اہم اصول ہے جو تربیت کے ضمن میں ہمیشہ سامنے رہنا چاہیے۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ تربیت عمل سے ہوتی ہے۔ کوئی کام خواہ کتنا ہی چھوٹا یا معمولی ہو، وہ کرنا چاہیے، چاہے تھوڑا ہی کیا جائے۔ اگر ہمارے عمل میں کوئی تبدیلی نہیں

آتی، کوئی نیا عمل نہیں شروع کیا، کسی پرانے عمل کو بہتر نہیں بنایا، کسی برائی کو نہیں چھوڑا، تو اس سے ایک فرد کی تربیت میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔

عمل خواہ تھوڑا کیا جائے لیکن باقاعدگی سے کیا جائے، یہی تربیت کی بنیاد ہے۔ ضروری ہے کہ کچھ وقت نکال کر ہم اپنا جائزہ لیں۔ اپنی پوری زندگی پر ایک نظر ڈالیں۔ آپ ۱۵ سال کے ہوں یا ۶۰ سال کے، آپ کے سامنے اپنی پوری زندگی موجود ہے۔

بل الانسان علٰی نفسہٖ بصیرۃ (القیٰمۃ/۱۴)

(انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے۔)

یعنی ہر انسان خود اپنے آپ سے بخوبی واقف ہے۔ کسی کو باہر سے وعظ و نصیحت کی ضرورت نہیں ہے۔

پھر یہ دیکھیے کہ اللہ کے حقوق و معاملات اور اللہ کے بندوں کے معاملات میں آپ نے کیا کیا خرابیاں کی ہیں۔ اس کے بعد استغفار کیجیے اور گناہوں سے توبہ کیجیے، اور کوشش کرکے غلط باتوں کو ترک کردیجیے اور اچھی باتوں کو اپنا لیجیے۔

اگر آپ فجر کی نماز مسجد میں جاکر باجماعت اور باقاعدگی سے نہیں پڑھتے تو آپ یہ فیصلہ کریں کہ میں کل سے یہ کام کروں گا۔ ممکن ہے کئی دن ایسے آئیں کہ آپ یہ کام نہ کرسکیں۔ لیکن جس دن نہ کرسکیں، اسی دن پھر استغفار کریں اور نئے سرے سے عزم کریں کہ اب کروں گا۔ اگر سو بار بھی یہ نوبت آجائے تو کوئی پروا نہیں۔ آپ پیچھے پڑے رہیں کہ مجھے اس کام کو کر کے ہی چھوڑنا ہے، تو یہ کام ہوجائے گا۔

نماز میں آپ نیت باندھتے ہیں اور نیت باندھ کر خیالوں ہی خیالوں میں کہیں اور چلے جاتے ہیں اور یہ خیال ہی نہیں آتا ہے کہ میں کس کے سامنے کھڑا ہوں، اور کس سے بات کر رہا ہوں، اور نماز کی صورت میں اللہ نے مجھے جو کچھ عطا کیا ہے وہ کیا ہے۔ حالانکہ اللہ نے آپ کی تربیت کے لیے پانچ وقت کی نماز کی صورت میں ایک نسخہ آپ کے ہاتھ میں تھما دیا ہے، اگر آپ واقعی اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوجائیں اور وہ ساری چیزیں آپ دوبارہ تازہ کرلیں جو آپ نماز میں پڑھتے اور کہتے ہیں، تو یہی تربیت کے لیے کافی

ہے۔ حدیث میں ہے کہ اگر کسی آدمی کے دروازے پر نہر بہ رہی ہو اور وہ پانچ وقت اس میں غسل کرے تو کیا اس کے جسم پر کوئی میل کچیل باقی رہے گا؟ کیا وہ پاک صاف نہیں ہو جائے گا؟ لیکن ہم جیسے اس نہر میں جاتے ہیں ویسے ہی اس سے واپس آ جاتے ہیں۔ وہ ساری گندگیاں جو دل و دماغ کو یا روح اور اخلاق کو آلودہ کیے ہوئے ہیں، ویسی کی ویسی ہی واپس آ جاتی ہیں۔

تربیت کا ایک ذریعہ اپنے ماحول سے سیکھنا، ایک دوسرے سے سیکھنا اور ایک دوسرے کی تربیت کرنا ہے۔ یہ بھی ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے۔ انسان جس ماحول میں رہتا ہے وہاں بعض باتیں اچھی لگتی ہیں، دل کو بھاتی اور موہ لیتی ہیں اور بعض باتیں ناگوار اور باعث اذیت۔ ایسے لوگ ملتے ہیں جو اچھے ہوتے ہیں اور ایسے لوگ بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو اچھے نہیں ہوتے۔ ان میں سے کسی سے دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ درگزر کریں اور معافی کا رویہ اختیار کریں۔ کسی کی خرابی دیکھیں، اگر ممکن ہو تو اس کی خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ بتا دیں، توجہ دلائیں اور اس کی اصلاح کی کوشش کریں۔

ہر جگہ ہر بستی میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ کوئی انسان کسی پہلو سے مثالی نہیں ہوتا۔ انسان خیر و شر کا پتلا ہے۔ کسی انسان کی زندگی اس پہلو سے خالی نہیں ہوتی۔ اگر ہم اپنی زندگی کا جائزہ لیں تو اس میں اچھائیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی۔ ہر انسانی بستی ایسی ہی ہوتی ہے، اچھی باتیں بھی ہوتی ہیں اور بری باتیں بھی۔ ہمیں اچھی باتوں سے اثر قبول کرنا چاہیے اور بری باتوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ جو باتیں آپ کو بری لگتی ہیں کم از کم خود ان کا ارتکاب نہ کریں۔ یہ بھی تربیت کا ذریعہ ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ماحول اور گرد و نواح میں پائے جانے والے لوگ کس طرح آپ کی تربیت کرتے چلے جاتے ہیں۔

یہ چند بنیادی اصول ہیں اس کے علاوہ مزید دو اہم باتیں تربیت میں اپنی جگہ بہت اہمیت کی حامل ہیں۔

اعمال تو بہت سارے ہو سکتے ہیں لیکن جتنا آپ کر سکیں، اس کو غنیمت سمجھیے۔ اللہ

نے جتنی توفیق دی ہے، اس پر اس کا شکر ادا کیجیے۔ آپ کو سب سے بڑھ کر فکر اس بات کی ہونی چاہیے کہ جو عمل بھی کریں، صرف اللہ کے لیے ہو۔ اصل میں یہ اخلاص ہی ہے جس سے اعمال میں اللہ کا رنگ پیدا ہوتا ہے، وزن پیدا ہوتا ہے اور اعمال کا زندگی پر اثر پڑتا ہے۔

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاء (البینۃ/ ۵)

(یعنی اللہ نے جس چیز کا حکم دیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم اللہ کی بندگی کریں، اس کے لیے دین کو خالص کر کے اور اس کے لیے یکسو ہو کر۔)

گویا اپنا قبلہ، اپنا محبوب اور مطلوب صرف اللہ کو بنایا جائے۔ ہر عمل اس کے لیے ہو۔ اگر ہم نماز پڑھیں تو اس کے لیے، تجارت یا نوکریں تو اس کے لیے، اجتماع کریں تو اس کے لیے، دعوت کا کام کریں تو صرف اس کے لیے۔ جتنا آپ اس پہلو کو سامنے رکھیں گے اور اس میں اخلاص پیدا کریں گے، اتنا ہی آپ کے اعمال، اللہ کے ہاں وزنی قرار پائیں گے اور قبول ہوں گے اور جتنا آپ اس کے بغیر عمل کریں گے اُسی قدر ہی اعمال بے وزن اور خیر و برکت سے محروم ہوں گے۔ عمل اگر اللہ کے لیے خالص نہیں ہے تو خواہ نماز ہو یا تعلیم قرآن یا انفاق، حتٰی کہ آدمی جان بھی قربان کر دے، لیکن یہ اعمال اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوں گے۔ لٰہذا لوگ جو اعمال دکھاوے کے لیے کرتے ہیں تو قبول نہیں ہوتے۔ اللہ کے ہاں صرف وہی عمل قبول ہوگا جو خالص اُسی کے لیے ہو۔

دوسری بات حقوق العباد سے متعلق ہے۔ اسلام میں بندوں کے حقوق اور بندوں کے معاملات کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اللہ نے ہر انسان کی جان، اس کا مال اور اس کی عزت، تینوں کو حرام قرار دیا ہے۔ ہم میں سے شاید ہی کوئی ہوگا جو کسی کی جان لینا چاہے گا، لیکن مال کے معاملے میں لوگ بڑے بے احتیاط ہوتے ہیں۔ کسی کی مرضی کے بغیر اس کا مال لینا حرام ہے۔ کسی کا حق مار لینا یہ اس سے بھی بڑا حرام کام ہے اور یہ ایسا جرم ہے جس کی کوئی تلافی نہیں ہے، الا یہ کہ اس کا بدلہ دیا جائے۔ شراب پی، تو یہ ایسا گناہ ہے کہ اللہ استغفار سے شاید معاف کر دے لیکن اگر کسی کا حق مار لیا، کسی کا مال ناجائز طور پر کھا لیا، تو جب تک اس کا بدلہ نہ دے دیا جائے، اس کو معاف نہ کروائیں، کوئی معافی نہیں ہے۔

بندوں کے حقوق اور معاملات کی جب اس قدر اہمیت ہے تو پھر اس کا ناگزیر تقاضا ہے کہ ہم کسی کو ایذا نہ پہنچائیں، تکلیف نہ دیں۔ بیوی بچے ہوں یا دوست احباب، یا کوئی اور شخص جو ساتھ آ کر بیٹھ جائے، ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ کسی کو بھی ہم سے تکلیف نہ پہنچے۔ ایک پڑوسی تو وہ ہے جس کا دروازہ ہمارے گھر کے دروازے کے ساتھ ملا ہوا ہے، ایک پڑوسی وہ ہے جو ہمارا رشتے دار بھی ہے، لیکن ایک پڑوسی وہ ہے جو پہلو میں آ کر چند لمحوں کے لیے بیٹھ جائے۔ ہر پڑوسی کا ہم پر حق ہے۔ جو ساتھ بیٹھا ہوا ہے اس کا بھی حق ہے، جو کمرے میں ساتھ رہتا ہے اس کا بھی آپ پر حق ہے، اور ان سب حقوق کا قرآن مجید میں ذکر موجود ہے۔ بیوی بچے بھی پڑوسی ہیں، ایک لحاظ سے ان کا بھی حق ہے۔ لہٰذا بندوں کے یہ حقوق کہ ہم کسی کو ایذا نہ پہنچائیں، کسی کا حق نہ ماریں، کسی کی عزت پر حملہ نہ کریں، زبان کو پاک صاف رکھیں، برے انداز میں کسی کا ذکر نہ کریں، کسی کا مذاق نہ اڑائیں، کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے کسی کو تکلیف پہنچے، دل آزاری ہو، جذبات کو ٹھیس پہنچے وغیرہ وغیرہ، ہماری خصوصی توجہ چاہتے ہیں۔

یہ دو بڑی اہم باتیں ہیں کہ اللہ کی مرضی و خوشنودی کے لیے کام کرنا، اور بندوں کا حق نہ مارنا اور ان کو تکلیف نہ پہنچانا۔ انھی دو اصولوں کی بنیاد پر آپ عمل کرتے جائیں تو ان شاء اللہ آپ کو اپنی تربیت کے لیے بڑی مدد ملے گی۔

تربیت کے ضمن میں یہ چند بنیادی باتیں ہیں۔ ہم انھیں یاد رکھیں اور یہ اہم ترین اصول ہمیشہ پیش نظر رہے کہ ہر فرد اپنی تربیت کا خود ہی ذمہ دار اور جواب دہ ہے۔ درس قرآن، تقاریر، تربیت گاہیں، دوست احباب، مطالعہ لٹریچر، گرد و نواح کا ماحول اور افراد تب ہی معاون و مددگار اور مؤثر ہوں گے جب ہم ارادہ اور عزم مصمم کر لیں کہ ہمیں اپنی تربیت آپ کرنا ہے، اور پھر اس کے لیے عمل شروع کر دیں خواہ وہ کتنا ہی معمولی ہو لیکن ہو مسلسل۔ یہی تربیت کی بنیاد ہے۔

(تلخیص مضمون، شائع شدہ ترجمان القرآن، فروری ۲۰۰۵ء)